ارمغانِ محبّت

فلسفۂ اقبال کی حیات آموز ماہیت

پروفیسر غلام رضا سعیدی

ترجمہ: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

41304

[جناب سعیدی کے اس مضمون میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے زیادہ تر علامہ کے اُردو اشعار سے استفادہ کیا ہے جو اُن کی اردو زبان سے خاصی واقفیت کی غماز ہے۔]

جن ممتاز محققین نے مشرق کے عظیم مفکر اقبال کے فلسفے کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے:

> اقبال نے جو کچھ بھی، بطور ایک مفکر، کہا ہے، اس کی جڑیں ایک مفہوم میں جاگزیں ہیں جسے اقبال نے 'خودی' یا ذات کا نام دیا یا جو دوسرے لفظوں میں 'نفس' ہے، اور اقبال کے تمام فلسفیانہ افکار کا سرچشمہ یہی معنی ہے اور عقلی و علمی طور پر اسی مفہوم یعنی مفہوم 'خودی' سے وابستہ ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے تمام افکار عقلاً و معناً فقط اس وسیلے سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے:

'کہ اقبال کے افکار کا مجموعہ ایک ایسے فکری نظام اور فکری سسٹم کے سلسلے کی بنیاد رکھتا ہے جس کا ہر مفہوم، معنی کے لحاظ سے، اس کے تمام افکار کے ذریعے تقویت و تائید پاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ ہم اس کے کسی بھی فکر کو اُس وقت تک نہیں جانچ سکتے جب تک ہم 'خودی' کے مطلب و مفہوم کو، کہ اس کے فکری نظام کا مرکزی مغز ہے، پورے طور پر نہ جانچ پرکھ لیں۔ اس کے برعکس جب تک ہم اس کے فکر کے مختلف مفاہیم میں سے جو اس کے نظریے کے مطابق مفہوم 'خودی' ہی سے تشکیل یافتہ اور اس کی بنیادی دلالتوں میں سے ہیں، ہر ایک مفہوم کو نہ پا جائیں، خودی کی صحیح تشخیص اور جانچ غیر ممکن ہوگی۔

ناسخ حکم ان کے علم میں ہوگا۔ کیا کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نصِ قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو؟

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دریافت کردہ مسئلہ کا جو جواب وحی کی بنا پر دیا وہ تمام امت پر حجت ہے اور وہ وحی بھی قرآن مجید میں داخل ہوگئی۔ لیکن جو جواب محض استدلال پر دیا گیا جس میں وحی کو دخل نہیں کیا، کیا وہ بھی تمام حجت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں: نبوت اور امامت۔ نبوت میں احکام قرآنی اور آیاتِ قرآنی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استنباط داخل ہیں۔ اجتہاد کی بنا محض عقلِ بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے، کیا یہ بھی وحی میں داخل ہے؟ اگر وحی میں داخل ہے تو اس پر آپ کی دلیل کیا ہے؟

وحیِ غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے متعلق صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت آئے گا یا امامت کے تحت میں؟

آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے، صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے؟

آیۂ وصیت کی وضاحت کیجئے؟

کیا امام کو اختیار ہے کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد (مثلاً سرقہ کی حد) کو ملتوی کر دے اور اس کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے؟ اس اختیار کی بنا کون سی آیتِ قرآنی ہے؟

امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے؟

ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا امام ہو یا اسلامی دنیا کے لیے ایک امام ہونا چاہیے؟ مؤخر الذکر صورت موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیسے بروئے کار آ سکتی ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طلاق کے متعلق جو طریقہ اختیار کیا، اگر اس کا اختیار انہیں شرعاً حاصل تھا تو اس اختیار کی اساس کیا تھی؟ زمانہ حال کی زبان میں آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن ان کو ایسا اختیار دیتی تھی؟ فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے، وہ بیوی کو یا اس کے کسی خویش یا کسی اور آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ اس مسئلہ کی بنا کوئی آیت قرآنی ہے

اور یہ کیونکر ہے کہ اقبال نے اپنے تمام افکار کو فکرِ واحد کی اساس پر کھڑا کیا ہے۔

کیا اس حالت کی کوئی بنیادی صورت اور اصولی شکل رہی ہے، یا یہ کہ یہ محض ایک اتفاق ہے؛ تو اس وقت ہم آسانی سے ان سوالوں کو ایک طرف رکھ سکتے ہیں، لیکن کیا کرنا چاہیے کہ جس سے صرف فکرِ اقبال کی تفہیم کے یہ سوالات اٹھائے جائیں اور ان کا جواب بھی دیا جائے؟..... [یہاں جناب سعیدی نے ماہیتِ جہان کی حقیقت سے بحث شروع کر دی ہے جو طویل ہے۔ اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف ان حصّوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہے جن کا تعلق علامہ سے ہے۔ یزدانی]

..... تو جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام دنیا میں مادّے کے لیے ایک ہی طرح کے قوانین نافذ اور مؤثر ہیں تو پھر ایسا دعویٰ کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کے ایک حصّے کا خالق دنیا کے باقی حصّوں کا خالق نہیں ہے۔

اقبال بھی دوسرے تمام فلسفیوں کی طرح دنیا کو اس کے تمامتر اختلافات و تضاد اور رنگا رنگی کے باوجود ایک وحدت سمجھتا ہے اور اسی بنا پر کہتا ہے:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصّۂ جدید و قدیم

..... یہی وجہ ہے کہ ہر فلسفی کے مانند اقبال کا فلسفہ ایک معیّن فکری نظام ہے۔

بہرحال، اقبال اور دوسرے فلسفیوں میں ایک بنیادی اختلاف ہے۔ یہ اختلاف اِس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اقبال کے نظریے کے مطابق وحدتِ عالم کی اصل جو اس تمام رنگا رنگی اور تنوع کو وحدت میں بدل دیتی ہے، خدا ہے ـــــ اپنی تمام صفات کے ساتھ ـــــ اس طرح کہ پیغمبر (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی آخری تعلیمات میں وہ متصوّر و مجسّم ہو گیا ہے۔ دوسری طرف یہ جاننا ضروری ہے کہ حقیقتِ عالم کے بارے میں فلاسفہ کے افکار بالکل مختلف ہیں ـــــ

اِس خیال سے کہ خدا نہ اصل و اساس ہے جو کائنات کے تمام اجزاء و ارکان کو وحدت کی شکل دیتا ہے، عاشق یا خدا سے واقعی محبّت کرنے والا تمام کائنات کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے۔ اِسی مناسبت سے سعدی کہتا ہے ؎

عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از وست
(میں تمام کائنات پہ عاشق ہوں کیونکہ ساری کائنات اُس کی ہے)

..... ہاں، ذاتِ ربوبیّت پوشیدہ اور مخفی ہے لیکن کائنات کی تخلیق اس کے وجود کو جلوہ گر کرتی ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو اسرارِ کائنات کے آشکارا ہونے پر منتج ہوتی ہے؛ چنانچہ اقبال

اسی ضمن میں کہتا ہے ؎

ایں گنبدِ مینائی، ایں پستی و بالائی
در شد بدلِ عاشق، با ایں ہمہ پنہائی
اسرارِ ازل جوئی؟ برخود نظرے داکن
یکتائی و بسیاری، پنہائی و پیدائی

(یہ پستی، یہ بلندی۔ اور یہ گنبدِ مینائی یعنی آسمان اپنی تمام وسعت کے باوجود عاشق کے دل میں سما جاتا ہے۔ تُو ازل کے بھیدوں کا جویا ہے تو خود پر ذرا نظر کر کہ تُو وحدت بھی ہے اور کثرت بھی، پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی)

مزید وضاحت کی خاطر یہ کہنا چاہیے کہ شاعر کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ اگر تم اسرارِ ازل سے آگاہ ہونا چاہتے ہو یعنی خدا تعالیٰ کی ذات کے دونوں پہلوؤں کو پہچان لو تو اپنے وجود کو مطالعہ و تحقیق کا مورد ٹھہرا کر دیکھو۔ اس کے باوجود اگر تم یکہ و تنہا ہو، دو پہلوؤں کے حامل ہو، ایک اندرونی پہلو کہ پوشیدہ اور ناپیدا ہے اور وہ تمہارا باطن ہے، اور دوسرا تمہارا ظاہری اور صوری پہلو کہ واضح اور آشکار ہے اور تمہاری ظاہری ذات جو کئی مختلف جلووں کی حامل ہے ..... ۔

عقل ہمیں منزل کی راہ دکھاتی ہے لیکن وہ خود منزل تک نہیں پہنچتی بلکہ منزل تک پہنچنے کے لیے صرف الہام ہی وسیلہ بنتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اقبال کہتا ہے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے!

..... اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے، چراغِ رہگزر ہے
دورنِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ راہگزر کو کیا خبر ہے!

یعنی عقل ایک راہ گیر انسان کی آنکھ کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے۔ عقل کیا ہے؟ سوائے اس کے کہ چراغِ راہ ہے۔ جو شور و غل اور ہنگامہ گھر کے اندر برپا ہے، راستے کے چراغ کو اس کی کیا خبر ہو سکتی ہے!

غرض ..... جیسے ہی ہم یہ محسوس کرنا شروع کر دیں کہ ہم نے کوئی دانش حاصل کر لی ہے یا ہم نے کسی چیز کے بارے میں جان لیا ہے تو یہاں ہماری عقل کا فریضہ ختم اور الہام کا فریضہ شروع ہو جاتا ہے۔

..... اگر ہم فطرت، ماہیت، صفات اور 'خودی' (دوسرے لفظوں میں ذات یا نفس) کی خصوصیات کے موضوع پر، جس کا اقبال سہارا لیتا ہے، اور حس و عقل اور الہام کے اندرونی رابطوں کے بارے میں غور و فکر کریں تو یہ نکتہ بیش از بیش واضح ہوتا جائے گا کہ اقبال 'عشق' یا 'شعور' یا 'بصیرت' کی طرف پوری پوری توجہ کے باوجود الہام کو کیوں پیش نظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

یعنی ..... تمہارے درد کا علاج صرف بصیرت میں ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است
زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ ادرا
جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است

(میں سلطنتِ عشق سے ایک نیا لشکر تیار کرتا ہوں کہ حرم میں خرد کی بغاوت کا کچھ خطرہ ہے۔
..... زمانہ اس کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، جنوں ایک ایسی قبا ہے جو خرد کے قامت کے لیے موزوں ہے)

..... (ذیلی عنوان "حقیقتِ جہان، بزرگترین زیبائیہا" کے تحت بعض نظریات سے بحث ہے۔ اس میں اقبال کے صرف ایک اردو شعر کا حوالہ آیا ہے۔ اس کے بعد دوسرا ذیلی عنوان ہے "نبوت بمعنی واقعی حقیقت"۔ اس میں اقبال کا کچھ ذکر آیا ہے، لہٰذا اس کی تلخیص کی گئی ہے)

اس مختصر سی بحث میں ظہورِ نبوت کے متعلق اقبال کے نظریے کی توضیح و تشریح کسی حد تک مشکل ہے اس لیے یہاں اس نکتے کی وضاحت کی جاتی ہے کہ بشریت کے لیے ہر پیغمبر کی اولین اور

گرانمایہ موہبت (عطائے الٰہی) حقیقتِ کائنات کے صحیح معنی جانتا ہیں، بالکل اُسی طرح جس طرح خدا کے وجود کا مفہوم اُس پر ظاہر ہے .....

اِس لحاظ سے پیغمبر اوّلین شخص ہے جو حقیقتِ کائنات کا مکمّل مفہوم، کہ فلسفۂ کامل کی یہ تنہا اساس ہے، بشریت کو عطا کرتا ہے۔

اِس پیغمبر کے ظہور کے بعد نبوّت کا اختتام ایک قدرتی امر ہے اور اس کے بعد نسلِ انسانی اپنی زندگانی کو کمالِ رفعت تک ـــــ پُرمائگی اور اعتبار و آبرو کے لحاظ سے ـــــ پہنچانے میں کسی قسم کی مشکل سے دوچار نہ ہوگی۔ آخری پیغمبر جس نے حقیقت کا کامل جہان بشریت کو عطا کیا، رسولِ اکرم حضرت محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہیں اور سب سے پہلا فلسفی جو اس اُمر کا وسیلہ بنا کہ حقیقت کا یہ کامل مفہوم، نبوّت کامل کے ذریعے، سائنس کی ترقّی کے اس زمانے میں، اُس کے فلسفے کی بنیاد بنے، اقبال ہے، اور وہ فلسفہ جو سائنس اور علم کے مسلّمہ حقائق اور اصولوں کو حقیقت کے کامل مفہوم کے مطابق ڈھالتا ہے، فلسفۂ خودی ہے جسے اقبال نے پیش کیا ہے۔

اقبال کے مطابق یہ ہے اُس حقیقت کا مفہوم جو صحیح ہے، اور جو کائنات کی تمام معلوم حقیقتوں کو ایک وحدت کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال بار بار اِس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر وہ فلسفہ جس کی اساس حقیقت کے نبوی مفہوم پر نہ ہو اور اس سے ہٹ کر کسی اور مفہوم پر مبنی ہو، ایک ایسا فلسفہ ہے جو فلسفی کے ذریعے کائنات سے متعلق ناقص علم کی بنیاد پر وضع ہوا ہے، اور وہ چیز (فلسفہ وغیرہ) جو ہدایتِ نبوّت سے جُدا اور آزاد ہو، وہ کذب و عقیم (بانجھ) ہوگی۔ چنانچہ آج تک جتنے بھی فلسفیانہ نظام ظہور پذیر ہوئے ہیں، اِسی قسم کے ہیں۔ یہ صرف خدا کے عشق ہے جو انسانی اور کائناتی فلسفے کی عمارت کی بنیاد رکھ سکتا ہے، اور اِس عشق کا سرچشمہ گویا خضوع (انکسار، فروتنی) اور پورے طور پر پیغمبر (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے حضور تسلیم خم کرنا ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

ہاں، حقیقت کا مفہوم واقعی فقط خدا کے مفہوم سے عبارت ہے جو زندہ ہے اور تمام کائنات کی نگہبانی کرتا ہے اور اُس کا نظام چلاتا ہے۔ باقی تمام مفاہیم و معانی ان اشیاء کے مفاہیم ہیں جو مردہ اور بے جان ہیں اور جو کبھی زندہ نہیں رہیں۔ ظاہر ہے ایسی مردہ چیز کی تجلّی بذاتہٖ بے معنی ہے اور اس

کا متا معلوم، اور اگر آج اس طرح کے معانی روشن اور واضح نہیں تو کل روشن و آشکار ہو جائیں گے؛ چنانچہ اقبال اسی نسبت سے اپنے ایک اردو شعر میں کہتا ہے کہ ہر وہ فلسفہ جو عشق خدا سے (کہ ہمیشہ زندہ ہے) خالی ہے یا تو مُردہ ہے یا پھر قریب مرگ۔ اسی طرح اپنے دوسرے دو اردو شعروں میں اُس نے اس بات کو کسی دوسری صورت میں واضح کیا ہے۔ کہتا ہے:

فلسفی رازِ محبت سے بے نصیب رہا۔ اُس نے ممکن حد تک بلند پروازی کی لیکن اُس کی پرواز جرأت و بسالت سے عاری رہی۔ یہ صحیح ہے کہ کرگس (گدھ) شاہین کے مانند آسمانوں پر پرواز کرتا ہے لیکن وہ زندہ شکار کرنے کی لذت سے بے بہرہ ہے، اُس کے لیے اس میں کوئی سُرور نہیں۔

ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

حکیماں مُردہ را صورت نگارند
بدِ موسیٰؑ، دمِ عیسیٰؑ ندارند
دریں حکمت دلم چیزے ندید است
برائے حکمتِ دیگر تپید است

(فلسفی مُردے کی تصویر کشی کرتے ہیں، وہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ [معجزۂ یدِ بیضا] اور حضرت عیسیٰؑ کے دَم [پھونک مار کر مُردوں کو جِلانے کا معجزہ] سے محروم ہیں۔ اس حکمت و فلسفہ میں دل نے کوئی چیز نہیں دیکھی، وہ کسی دوسری حکمت کے لیے تڑپا ہے)

"یہ حکمتِ دیگر" وہی فلسفہ و حکمت ہے جو حقیقت کی بنیادوں پر استوار ہے اور جو کاملِ نبوت کے عامل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ تو یہی مفہوم ہے جو اُس حقیقی و واقعی عشق و محبت کا سرچشمہ اور منبع ہے، اور فلسفی کو جس کی ضرورت ہے۔

اور پھر یہی وہ محبت و عشق ہے جو انسان کو کائنات کے پوشیدہ اسرار کے الہام سے نوازتا ہے۔ نیز یہی وہ عشق ہے جسے اقبال نے شاعرانہ انداز میں "خونِ جگر" کا نام دیا ہے۔ اور وہ فلسفہ جسے موت نہیں چھوتی اور جسے موت سے کوئی وحشت نہیں ہے، اسی خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی کے پیشِ نظر وہ کہتا ہے ؎

می ندانی عشق و سنی از کجا ست
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ ست

(تجھے علم نہیں کہ عشق و مستی کا سرچشمہ کہاں ہے۔ یہ آفتابِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شعاع ہے)

اسی موضوع کی تائید میں وہ ایک دوسری جگہ کہتا ہے ؎

نشانِ راہ زعقلِ ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

(ہزاروں مکر و فریب کی حامل عقل سے راستے کا نشان مت پوچھ۔ عشق کی طرف آ کہ وہ ایک فنی (ایک فن کا ہونا) کے کمال سے بہرہ ور ہے)

یعنی عقل ہزاروں صاحبِ راستوں کے ہوتے ہوئے تنہائی (اصل) راہ کا پتہ نہیں دے سکتی اس صورت میں خدا کے عشق و محبت میں دل لگانا اور اُس (عشق) سے رہنمائی کا طالب ہونا چاہیے کیونکہ عشق ایک خاص فن اور ممتاز ہنر کا حامل ہونے کے باعث اس رہنمائی سے بخوبی عہدہ برآ ہوتا ہے۔

اقبال ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

بچشمِ عشق نگر تا سراغِ او گیری
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

(عشق کی آنکھ سے دیکھ تاکہ تو اس کی نگاہ کو دیکھے۔ خرد کی آنکھوں میں کائنات محض وہم و گمان اور طلسم ہے)

یعنی کائنات کی حقیقت کو صحیح معنوں میں جاننا عقل کی نظر میں طلسم ہے، وہم و گمان اور شعبدہ ہے؛ لہٰذا اس حامل کے ذریعے تم اپنے مقصد تک نہ پہنچ پاؤ گے۔ اسی موضوع سے متعلق اُس نے ایک اردو شعر میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

اُس علم سے جو کلیمؑ یعنی بصیرتِ موسیٰ کے قریب نہ ہو بلکہ محسوس اور مشہود اظہارات کے نزدیک ہو جن کا پیچھا عالمِ طبیعی کرتا ہے، نقصِ بصیرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ بالآخر قاطع فتویٰ اور آخری رائے یہ ہے کہ ہم کہیں ؎

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ
انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
لا و الّا انتسابِ کائنات
لا و الّا فتحِ بابِ کائنات

(کائنات کے ادوار یعنی گردشوں کا نقطہ 'لا الٰہ' ہے۔ کائنات کے معاملے کی انتہا 'لا الٰہ' ہے۔

'لا' اور 'اِلاّ' کائنات کا احتساب ہیں۔ 'لا' اور 'اِلاّ' سے کائنات کا دَر وا ہوتا ہے۔ 'لا' اور 'اِلاّ' سے مراد ہے: لاَ الٰہ اِلاّ اللّٰہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)

پھر وہ انجام امر کے اثبات اور تائید کے لیے ایک اردو شعر میں اس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے کہ وہ فلسفی حکمت توحید کے اصلی اور اساسی نکتے کا ادراک نہیں کر سکا۔

واقعی، اس نادر ہو لے نکے اسرار کے ادراک کے لیے بصیرت کی ضرورت ہے، اور فقط بصیرت کی قوت ہی اس بھید کو پا سکتی ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا موجود نہیں ہے یا اس کے سوا کوئی فرماں روا اور صاحبِ اثر و نفوذ نہیں ہے۔

غرض ہر علم اور ہر حکمت کی حقیقت ہی اِس حقیقی فلسفے، اور فقط اسی فلسفے کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے اور بس۔ اِس نکتے اور حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جہاں کہیں سے بھی حکمت میسّر آئے، اُسے حاصل کرنا چاہیے اور اسی فلسفے سے اُسے ملانا چاہیے ؎

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

(خدا نے حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے۔ جہاں کہیں سے بھی یہ خیر ہاتھ لگے لے لے)

اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ 'خدا' کے مفہوم کو جو صحیح فلسفے کی واحد بنیاد و اساس ہے، فلسفیانہ رنگ دینا چاہیے کیونکہ اِس اقدام کے بغیر نہ تو کوئی فلسفہ ہی قبولِ عمومی کا مورد ٹھہر سکے گا اور نہ انسان ہی غلط قسم کے فلسفوں کے شر سے نجات پا سکیں گے۔ اِس طرح کا فلسفہ ایک انقلاب برپا کر سکے گا اور دنیا میں ایک نئے نظریے کی بنیاد رکھ سکے گا۔

اقبال اِس امر کے پیشِ نظر کہ اہلِ مغرب رازِ کائنات کے انکشافات کی خاطر عقل کے سرچشمے سے کام لے رہے ہیں، جبکہ اہلِ مشرق نے سازِ عشق کے تار چھیڑ رکھے ہیں، ان دونوں نظریات کے انضمام کی خاطر تدبیر اور رازہائے عشق کے مرکب کا قائل ہے کیونکہ اُس کے نزدیک انسانی درد و الم کے علاج کے لیے یہ انتہائی شفا بخش نسخہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

غربیاں را زیرکی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود
نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

(اہلِ مغرب کے لیے عقل و خرد سازِ حیات ہے جبکہ اہلِ مشرق کے مطابق عشق کائنات کا راز ہے۔
= زیرکی یا خرد عشق سے مل کر حق شناس بنتی ہے۔ عشق کا معاملہ زیرکی سے محکم بنیادوں والا بنتا ہے۔
= عشق جب زیرکی کا ہمسر و ہم پلہ ہو جاتا ہے تو وہ ایک اور ہی عالم کا نقش ڈھالتا ہے۔
= اُٹھ اور ایک نئی دنیا کا نقش ڈھال، عشق کو زیرکی کے ساتھ ملا دے)

اقبال کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ حقیقت کے صحیح مفہوم کو آج تک کے تمام علمی و سائنسی انکشافات سے مربوط کر دینے کے بعد بھی، کشفِ حقیقت کے سلسلے میں انسان کی مسلسل تشنگی کے باعث، حقیقت کی تفسیر و تعبیر پورے طور پر نہ ہوگی، اس لیے کہ مستقبل میں بھی کسی وقفے اور تعطل کے بغیر ایسے نئے نئے انکشاف ہوتے رہیں گے اور حقیقت سے اُن کا ربط و تعلق رہے گا۔ ظاہر ہے یہ عمل جب تک کائنات قائم ہے، برقرار و جاری رہے گا اور آئے دن کی پیش رفت و ترقی کی روشنی میں کہیں زیادہ واضح طور پر اِس امر کی نشاندہی کرتا چلا جائے گا۔ اسی دلیل کے ساتھ اقبال نے اپنی کتاب 'تجدیدِ فکرِ دینی در اسلام' (علامہ کی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam. کا فارسی ترجمہ) میں اس بات کی تصریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب دانش آگے بڑھے گی اور فکر کے نئے چشمے پھوٹیں گے تو اس بات کا امکان ہے کہ دوسرے نظریات سے جن کے بارے میں پہلے بیان ہو چکا ہے، زیادہ صحت مند اور درست صورت میں سامنے آئیں گے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم پوری توجہ سے انسانی فکر کی ترقی پر نظریں مرکوز رکھیں اور مستقبل کی پیش رفتوں کی طرف ایک مکمل طور پر آزاد اور حساس روش اپنائیں (تجدیدِ فکر... ص ۶)

عبادت اور شناختِ حقیقت

لیکن آج اگر کوئی چاہتا ہے کہ وہ حقیقت کے بارے میں بطورِ مطلق کوئی معرفت حاصل

کرے تو اُسے چاہیے کہ وہ قطعی طور پر نماز، دعا اور گریہ وزاری کے ذریعے اور ذاتی احساس اور مکمل بصیرت کے ساتھ، نیز جمالِ حقیقت کے ساتھ عشق سے اس طرف متوجہ ہو اور خدا سے دعا کرے کہ وہ اسے اور اک حقیقت کی توفیق دے۔ اس سے ہٹ کر وہ کسی قدر بھی موہبتِ خاص کا حامل کیوں نہ ہو حقیقت کے بارے میں کوئی مکمل توضیح و تشریح پیش نہ کر سکے گا۔ اسی طرح کوئی بھی فرد دوسروں کے بیانات و توضیحات کے مطالعے یا اُن پر کان دھرنے سے معرفتِ کامل میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اقبال نے اِس موضوع سے متعلق اردو میں چند اشعار کہے ہیں جو اِس خاطر کہ فارسی زبان والوں کے فہم کے نزدیک ہیں، اُسی طرح پیش کیے جاتے ہیں ؎

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

(جناب سعیدی نے ان اشعار کی تشریح کرتے ہوئے، اِسی مضمون کے حوالے سے، سعدی کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

دل آئینۂ صورتِ غیب است ولیکن
شرط است کہ بر آئینہ زنگار نباشد

ترجمہ: دل صورتِ غیب کا آئینہ ہے، لیکن یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب آئینہ زنگ سے پاک ہو)

رومی اِسی بات کو بڑے گرانمایہ اور زور دار الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں
چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں
گرچہ تفسیرِ زباں روشنگر است
لیک عشقِ بی زباں روشنتر است
چوں قلم اندر نوشتن می شتافت
چوں بعشق آمد قلم برخود شگافت
چوں سخن در وصفِ ایں حالت رسید
ہم قلم بشکست و ہم کاغذ درید

عقل در شرحش چو خر در گل بخفت
شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
گر دلیلت باید از وی رُو متاب

(= مَیں عشق کی جتنی بھی تشریح و توضیح کروں، لیکن جب عشق میں وارد ہوتا ہوں تو اپنی اِس تشریح سے شرمندہ ہوتا ہوں۔

= اگرچہ زبان کی تشریح بات کو روشن کرنے والی ہے لیکن عشقِ بے زبان اس سے کہیں زیادہ واضح و روشن ہے۔

= جب قلم لکھنے میں مصروف تھا تو لفظِ عشق پر آ کر وہ اپنے آپ پھٹ گیا۔

= جب کلام اِس حالت (عشق) کے بیان میں پہنچا تو اس کا بھی قلم ٹوٹ گیا اور کاغذ پھٹ گیا، یعنی سب سامان بگڑ گیا۔

= اس کی تشریح و توضیح میں تو عقل کا یہ حال ہے جیسے کوئی گدھا کیچڑ میں پھنس گیا ہو۔ سو عشق و عاشقی کی شرح بھی عشق ہی نے کی ہے۔

= آفتاب خود اپنے وجود کی دلیل ہے۔ اگر تجھے پھر بھی دلیل کی ضرورت ہے تو اُس کی طرف دیکھ، اُس سے منہ نہ پھیر)

اقبال عاشقِ خدا ہے ـــــ ایک ایسا عاشق جو اپنے عشق کی تفسیر و تعبیر فلسفیانہ اصطلاحات کے ساتھ کرتا ہے تاکہ وہ اُس عشق کو اپنے قارئین کی طرف منتقل کر دے؛ اور جیسے ہی عشق کا شعلہ قاری کے دل میں پیدا ہو، وہ نماز، دعا اور گریہ و زاری کے لیے اٹھ کھڑا ہو پھر اِن اعمال کے ذریعے عشق کو اس مرحلے تک لے جائے کہ اُس کی بالیدگی اور توسیع و تکمیل کے واسطے اسے کسی قسم کے فلسفے، نقل اور استدلال کی حاجت ہی نہ رہے؛ یہاں تک اُس کے فلسفے ہی سے عشق وجود پذیر ہو۔ اور جو عشق اِس درجے تک پہنچ جائے، وہ شگفتہ (تر و تازہ) فلسفہ و حکمت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام سائنسی ظواہر، بنیاد کے لحاظ سے، گہرے طور پر فقط حقیقت سے متعلق فکر یعنی فکرِ خدا سے مربوط و منسلک ہوتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرّہ اِس امر کی شہادت دیتا ہے کہ کائنات کی صحیح حقیقت خدا ہی ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید واقعیت یا ظہورِ علمی کو خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے: "وفی الارض آیات للموقنین"

یعنی ان لوگوں کے لیے جن کا ایمان یقین کی حد تک پہنچ چکا ہو ، زمین میں نشانیاں ہیں ۔ مقصد یہ ہے کہ چونکہ کوئی بھی واقعیت یا علمی نمود حقیقت کے ان غلط مفاہیم سے عقلی طور پر اور استدلالاً مربوط و منتعلق نہیں ہو سکتی ، الہٰذا اس قسم کی ہر واقعیت یا نمود کہتی ہے : "ومن یدع مع اللہ الہاً آخر لا برھان لہ" یعنی جو کوئی خدا سے ہٹ کر کسی اور کو بلاتا ہے اور اپنے کام میں اُسے خدا کا شریک ٹھہراتا ہے ، اُس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں .... (اِس موضوع سے بحث کرنے کے بعد ذیلی عنوان ' انقلاب جہانی ' کے تحت جناب سعیدی نے حقیقت سے متعلق غلط مفاہیم اور صحیح مفاہیم کی بات کی ہے ....)

اِس ترتیب سے اور اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اس قسم کا انقلابی فلسفہ پیش کرنا ایک ایسا امر ہے جو غیر معمولی جرأت و جسارت کا طالب ہے اور اِس عمل کی ہر کسی سے توقع نہیں کی جا سکتی ، اس لیے کہ جو کوئی بھی اِس اقدام پر کمربستہ ہوتا ہے ، وہ گویا ایسا شخص ہے جو اپنے فلسفے کی تلوار سے عمومی افکار کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور ان افکار سے برسرِ پیکار ہو جو دونوں جہانوں سے متعلق ہوں ۔ اقبال کہتا ہے ؎

حکمت و فلسفہ را ہمتِ مردے باید
تیغِ اندیشہ برروے دو جہاں آختن است

(حکمت و فلسفہ کے لیے ہمتِ مردانہ کی ضرورت ہے ۔ یہ تو دونوں جہانوں پر فکر کی تلوار سونتنا ہے)

ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

خو گر من نیست چشمِ ہست و بود
لرزہ بر تن خستہ ام از بیمِ نمود

یعنی یہ عالمِ وجود موجودہ حالت میں جس طرح ہے ، اُس کی آنکھ میرے فکر سے مانوس نہیں ہے اس لیے مَیں نے سرکشی اختیار کی ہے اور اس سرکشی نے مجھے لرزا دیا ہے ، اور اپنے فکر کے اظہار کے ڈر سے جسے (فکر کو) مَیں دوسروں تک پہنچانے کی سعی کر رہا ہوں ، خود ہی کانپ رہا ہوں ۔

بہرحال ایسا ہنگامہ اور ایسا انقلابِ جہانی برپا ہونا چاہیے ۔ اِس طرح ایسے عصر میں کہ حقیقت سے متعلق غلط قسم کے مفاہیم کی بنیادیں گرنے والی اور اس عمارت کی منزلیں منہدم ہونے کے قریب ہیں ، ایک صحیح فلسفیانہ نظام پر مبنی ایک نیا جہان وجود میں آئے گا جو صحیح فکر کی اساس پر ہوگا اور جمالِ الٰہی کے عشاق کے ذریعے ان کی دلی آرزو کے مطابق وجود میں آئے گا اور ان کی دلی آرزو میں بھی خود خدا کے ارادے کے سوا کچھ نہ ہوں گی ۔ دوسرے لفظوں میں اس سے پہلے کہ ایسی صورتِ حال پیش آئے

جمالِ الٰہی کے عاشقوں اور خدا کے مابین اِس قسم کی گفتگو ہونا ضروری ہے ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد ؟
گفتم کہ نمی سازد ، گفتند کہ برہم زن!

(مجھ سے پوچھا گیا کیا ہماری دنیا تجھ سے موافقت کرتی ہے ؟ مَیں نے کہا نہیں کرتی تو مجھ سے کہا گیا کہ اسے تہ و بالا کر دے)

تو اِس موقع پر خدا اپنے جمال کے ان پرستاروں کو شوق دلائے گا اور کہے گا کہ جس طرح انہوں نے چاہا ہے، اُسی طرح ہوگا اور ان کے مخالفین مٹ جائیں گے ..... یہ اسی اطمینانِ خاطر کا نتیجہ ہے کہ اقبال کہتا ہے ؎

قدم بے باک تر نہ در رہِ زیست
بہ پہنای جہاں غیر از تو کس نیست

(زندگی کی راہ میں زیادہ بے باکانہ قدم رکھ کیونکہ کائنات کی وسعت میں تیرے سوا کوئی نہیں ہے)

جب اقبال عشقِ خدا پر مبنی جدید فلسفے کی ضرورت کی بات کرتا اور اس پر زور دیتا ہے، نیز اس پر تکیہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے، اور اسی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے وہ کہتا ہے ؎

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس ..... الخ

(یہ اشعار پہلے بھی آچکے ہیں)

..... اقبال واضح طور پر اور حضورِ ذہن کے ساتھ اِس عظیم فکری انقلاب کا مشاہدہ کرتا ہے جس کے مقابلے میں کائنات کا ٹھہرنا مشکل ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

انقلابے کہ نگنجد بضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

(مَیں ایک ایسا انقلاب جو افلاک کے سینے میں نہیں سماتا، دیکھ رہا ہوں اور کچھ معلوم نہیں کہ کس طرح دیکھ رہا ہوں)

اسی موضوع کی تائید میں اپنے ایک اردو شعر میں وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جو کچھ آنکھ دیکھ رہی ہے، زبان اس کے اظہار سے عاجز ہے، لیکن جب مَیں سوچتا ہوں تو حیرت و تعجّب کے ساتھ ملاحظہ کرتا ہوں کہ کس طرح اور واضح طور پر یہ دنیا بدل رہی ہے[۳]۔

اقبال کو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس کا فلسفہ اس عظیم فکری انقلاب کے ظہور کا اعلان کنندہ ہے۔ اسی بنا پر وہ کھل کر کہتا ہے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

.......ایک اور جگہ یہی بات دوسرے ڈھنگ میں یوں کی ہے کہ کائنات کی "تنظیمِ نو" ابھی پردۂ تقدیر میں مستور و مخفی ہے لیکن اس کی روشنیِ سحر، بوسیلۂ الہام، میری نظر میں محسوس و مشہود ہے۔[۵]

(یہاں نبوت کے منکر فلاسفہ سے متعلق بحث ہے جس سے صرفِ نظر کیا گیا ہے)........

اقبال خود اس بارے میں اپنے فکر کی ترسیع و اشاعت سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس موضوع میں اپنی شراکت کی اُس نے نشان دہی کی ہے اور اپنے فکر کی اہمیت کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا ہے، وہ شاعرانہ مبالغہ آرائی یا خودستائی نہیں بلکہ ٹھوس حقائق پر مبنی اور مسلّم ہے کیونکہ اس سلسلے میں اس خاموشیِ مطلق جائز نہ تھی اور اسے اس کے اظہار سے اجتناب نہ کرنا چاہیے تھا؛ چنانچہ اسی ضمن میں وہ کہتا ہے ؎

ذرّہ ام مہرِ منیر آنِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از نازادہائے عالم است
فکرم آن آہو سر فتراک بست
کو ہنوز از نیستی بیرون نجست

چشمۂ حیوان براتم کردہ اند
محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نسفت

(= مَیں ذرّہ ہوں، درخشاں آفتاب میرا ہے۔ سینکڑوں صبحیں میرے گریبان میں ہیں۔
= میری خاک جامِ جمشید سے بھی زیادہ تابناک ہے۔ وہ [میری خاک] کائنات کی ایسی اشیا

سے بھی واقف ہے جو ابھی وجود پذیر نہیں ہوئیں۔

= میرے فکر نے اس ہرن کو شکار کیا ہے جو ابھی عدم سے وجود میں نہیں آیا۔

= آبِ حیات کا چشمہ میرے مقدر میں لکھا گیا ہے۔ مجھے رازِ حیات کا محرم بنایا گیا ہے۔

= جو راز میں نے بتایا، کسی اور نے نہیں بتایا۔ میرے فکر کی طرح حقیقت کا موتی نہیں پرویا۔)

ایک اور جگہ اپنے وصفِ حال اس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے ؎

انتظارِ صبح خیزاں می کشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم
قلزمِ یاراں چو شبنم بے خروش
شبنمِ من مثلِ یم طوفاں بدوش

(= میں صبح خیزی کے خوگر لوگوں کے انتظار میں ہوں۔ میری آگ کے زرتشتی (مذکورہ لوگ) مبارک لوگ ہیں۔

= دوستوں کا سمندر شبنم کی طرح خاموش و پُرسکون ہے، میری شبنم سمندر کی طرح طوفاں بدوش ہے۔)

اسی مناسبت سے وہ کہتا ہے ؎

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں!

(زندگی مدتوں کعبے اور بتخانے میں نالہ و زاری کرتی ہے۔ تب جا کر بزمِ عشق سے ایک دانائے راز باہر آتا ہے)

[علامہ کا یہ اردو شعر اسی فارسی شعر کا گویا ترجمہ ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (بزرانی)

اور اپنی زندگی کے آخری دن اُس نے یہ شعر کہا ؎

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید!

(اِس فقیر کا زمانہ تو ختم ہوا۔ اب کوئی اور دانائے راز آئے کہ نہ آئے!)

اس لیے کہ بہت سے حضرات ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اگرچہ خیال صحیح ہے کہ کسی بھی غیر مسلم فلسفی نے اپنے فلسفیانہ فکر کی بنیاد حقیقت کے اس مفہوم پر نہیں رکھی جس کی اشاعت نبوتِ کامل کے حامل نے کی ہے لیکن اقبال سے پہلے جو مسلمان فلسفی آئے، وہ اس کے پابند رہے کہ اپنے فلسفے کی بنیاد خدا کے اسلامی مفہوم پر رکھیں۔ اگر معاملہ ایسا ہے تو پھر مسلمان فلسفیوں میں اقبال کو کیا امتیاز حاصل ہے، اس سلسلے میں ممکن ہے درخشاں شخصیتوں کے اسماء گنوانے کی ضرورت ہو، جیسے شاہ ولی اللہ دہلوی اور محی الدین ابن عربیؒ۔

اس بات کی وضاحت کے لیے یہ کہنا ضروری ہے کہ دیگر مسلمان فلاسفہ میں اقبال کو جو امتیاز حاصل ہے اس کا تعلق اس امر سے ہے کہ خودی کی فلسفیانہ اصطلاح استعمال کرنے کے نتیجے میں وہ خدا کے اسلامی مفہوم کو پیش کرنے میں کامیاب ٹھہرا ہے کیونکہ نہ فقط عقیدے اور خاص فکری بنیاد کے طور پر بلکہ ایک علمی و عقلی حقیقت کے طور پر، جو اس عصر میں دیگر تمام علمی و عقلی مفاہیم کے مقابلے میں معروف و مقبول ہے، اس نے اپنا فلسفہ معقول اور مدلل صورت میں پیش کیا ہے۔

نتیجۂ عمل یہ ہے کہ اقبال نے خدا کے اسلامی مفہوم کے علمی و عقلی حلقوں کو عصرِ حاضر کے دیگر حقائق یا علمی ظواہر کے ساتھ باہم مربوط و پیوست کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور یہ کامیابی اُسے فرد اور جماعت کی حیاتِ عملی کے تمام پہلوؤں کی توضیح و تشریح میں بھی ہوئی ہے۔ نیز اقبال اسی سابقے کی بنا پر اس مفہوم میں پوشیدہ استعداد کو باہر لانے اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوا کہ تمام حقائق یا کائنات کے ظواہر یعنی اُن تمام ظواہر کی ٹھوس تشکیل اور صحیح تفسیر کا واحد وسیلہ اسی فکر اور اسی فلسفے میں موجود ہے جو (ظواہر) دورِ حاضر میں انسانی علم کی رسائی میں ہیں یا مستقبل میں ہوں گے۔

ہاں، یہی وہ عمل ہے جو اقبال کے علمی قدر و مرتبہ کی تعیین کرتا ہے۔ حقیقت میں اقبال کے نبوغ کا یہ دلکش جلوہ احتیاجِ زماں کا حاصل اور اسی طرح عصرِ حاضر کے علمی ماحول کا اقتضا تھا جو اس صورت میں ظاہر ہوا، پھر یہ عصرِ حاضر کا عقلی ماحول اور مقتضیات تھے جنھوں نے اسے ایسی قدرت و قوت عطا کی تاکہ وہ اس دور میں اپنا کردار نبھا سکے اور ایک نئے علمی دور کی تعمیر کر سکے۔

.... آج اگر ملتِ اسلام یا کوئی بھی اور قوم کوشش کرتی ہے کہ وہ مادی منطق کو عقلی اور علمی اسلوب کے ساتھ، یعنی ایسے اسلوب کے ساتھ رد کر دے جو دورِ حاضر کے انسان کے لیے قابلِ فہم اور باعثِ طمانیت ہو تو اسے صرف فلسفۂ اقبال کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حقیقتِ بشر و کائنات کی معرفت کے معاملے میں انسان خاصہ تشنہ ہے اور اس حقیقت کے کشف کی راہ میں اسے مشکلات

اور رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ ان رکاوٹوں کو جو بھی ماہیت و خاصیت ہو، فطرت نے ان موانع کو دُور کرنے کے لیے جو علاج تیار کیے ہیں، وہ ان کے متناسب ہیں۔ فلسفۂ اقبال نے اِس عصر کے ظاہری خصائص کو ایک دوسرے کے ساتھ مِلا دیا ہے تاکہ یہ ان کے لیے تریاق ہو۔ محی الدین ابن عربی اور شاہ ولی اللہؒ جیسے عظیم مفکرین کا فلسفہ ان کے اپنے ادوار کے فلسفوں کا توڑ تھا، لیکن وہ عصرِ حاضر کے فلسفوں کا توڑ نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے اقبال یہ کہنے میں حق بجانب ہے ؎

ہیچ کس رازے کہ من گویم، نگفت
ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نہ سُفت

(= جو راز میں نے بیان کیا ہے، کسی نے بھی بیان نہیں کیا۔ میرے فکر کی طرح حقیقت کا موتی کسی نے نہیں پرویا)

اقبال بحیثیت ایک فلسفی کے چونکہ وحدتِ عالم کا قائل ہے، اس لیے لازم تھا کہ اس کا فلسفہ ایک خاص فکری نظام کی صورت اختیار کرتا۔ لیکن اقبال کے افکار نثر میں بیان ہونے سے پیشتر پورے طور پر شعر کی شکل میں سامنے آئے ہیں، اور جیسا کہ بخوبی واضح ہے، منطقی افکار کو باہم مربوط کرنے اور لطیف عقلی جزئیات کے اظہار کے لیے شاعری مناسب ذریعہ نہیں ہے، اور چونکہ اقبال نے اپنے بیشتر افکار شعر کی صورت میں بیان کیے ہیں، اس لیے اِس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک فلسفی جس طرح نثر میں اپنے افکار پیش کرتا ہے، اقبال نے بھی اپنے فلسفے کے تمام منطقی، لطیف اور گہرے افکار اور جزئیات کو اُسی طرح شعری جامہ پہنایا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا فلسفہ ایک واضح اور حاصلِ تسلسل نظام کی صورت میں اس کی ایک یا چند کتب میں مرتب و مدوّن نہیں ہوا۔ بہرحال، اس کے افکار متفرق اجزا کی شکل میں اس کے اشعار میں ملتے ہیں۔ چونکہ وہ ذوقِ شعر گوئی سے مالا مال تھا، اس لیے شاعری اس کے افکار کی اشاعت میں مفید بھی ٹھہری اور مؤثر بھی۔ شاعری ایک وسیلہ ہے جو افکار کو ایک انقلابی قوت کے ساتھ قارئین کے دلوں میں منتقل کرتا ہے۔ اگر اقبال صرف فلسفی ہوتا اور شاعر نہ ہوتا، تو ممکن ہے وہ اسلامی معاشرہ جس میں اقبال زندگی بسر کر رہا تھا، اور جس (معاشرے) نے فکری روایتوں اور نظام سے اپنا رابطہ قطع کر رکھا تھا، اس کے فلسفے سے تحرک پذیر نہ ہو سکتا؛ لیکن چونکہ ضرورت تھی کہ عوام کو زبردست طور پر جھنجوڑا جائے اور اس طرح انہیں جمود اور سکوت سے نکالا جائے، اس لیے اس کا جو علاج خدا نے لوگوں کے سامنے رکھا، وہ یہ تھا کہ اقبال اپنا فلسفہ شاعرانہ نغموں کی صورت میں لوگوں کے گوش گزار کرے تاکہ لوگ جلد بیدار ہوں، حرکت میں آئیں اور اُس کے

گرد جمع ہوں۔

اسی حقیقت کے پیشِ نظر اقبال اپنی قوم کو بلاتا ہے تاکہ وہ اس کا پیغام سنے، اور یہ اسی مقصد کی تکمیل کی خاطر ہے جو وہ کہتا ہے ؎

حلقۂ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گِل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

(اے آب و گِل کے پیکرو! میرے گرد جمع ہو جاؤ۔ میرے سینے میں ایک ایسی آگ ہے جو میں نے تمہارے اسلاف سے حاصل کی ہے)

غرض، یہ اقبال کے پیغام پر عمل کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پاکستان کے نام سے ایک نئی مملکت وجود میں لے آئے۔

اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ آیا ان اقوام نے جنہوں نے اقبال کی شاعری سے فیضان پایا اور انہیں تحریک ہوئی، ان افکار کو، جن کی دلالت اقبال کی شاعری میں سموئی ہوئی ہے، جامع و کامل صورت میں قابلِ عمل بنایا ہے تاکہ وہ فلسفۂ اقبال کی گہرائی طور پر قدر و قیمت متعین کر سکیں اور اسے محسوس اور آشکارا طور پر اور مکمل شکل میں دوسروں کے سامنے بھی پیش کر سکیں۔ ظاہر ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم فکرِ اقبال کے کامل مفہوم اور اس کے لائحۂ عمل کو عملی صورت دیں تو یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم چھوٹے سے چھوٹے علمی ظواہر یا حقائق سے بھی جو اس کے افکار کو پورے طور پر روشن کرنے والے ہیں، غفلت نہ برتیں۔

مطلب یہ کہ اقبال کے فلسفے یا فکر کی تشریح و تفسیر کرتے وقت (یہ پیشِ نظر رہے کہ اقبال کا فلسفہ ہر لحاظ سے کامل اور احاطہ کرنے والا ہے) ہمیں چاہیے کہ دقتِ نظر سے کام لیں تاکہ اس کی دل کشی، مکمل احاطہ اور جامعیت میں اور قوت کی حامل اس استعداد میں کوئی کمی واقع نہ ہو جو اس قوت کی واقعی حامل ہو سکتی ہے، اور وہ (فلسفہ) ایسی صورت اختیار کرے کہ کم ہی قابلِ فہم رہ جائے۔ نیز کسی ایسی علمی یا فلسفیانہ حقیقت سے یا کسی دوسرے فلسفیانہ فکر سے اغماض میں غفلت نہ کریں جو اقبال کے نظریے سے ہم آہنگ ہو۔ اقبال ذاتی طور پر اس نظریے کی تائید کرتا ہے جب وہ کہتا ہے ؎

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را دیدی بگیر

(خدا نے حکمت و دانش کو خیرِ کثیر کہا ہے۔ جہاں سے بھی تجھے یہ بھلائی میسر آئے، اسے

حاصل کر)

فکرِ اقبال سے متعلق اس قسم کی منظم حزم و احتیاط سے کام لینا نہ صرف یہ کہ علم، تعلیم اور انسانیت کی خدمت ہوگی بلکہ (یہ احتیاط) اقبال کو، اس کے فلسفے کی قدر و وقعت جاننے کے لیے، دنیا اور اہلِ دنیا کے درمیان، ایک ایسا معیار اور کسوٹی قرار دے گی جو اس کے مقام و مرتبہ کو اطمینان کے ساتھ واضح کر سکے گی۔

ہر چند اقبال نے کئی مرتبہ یہ بات ظاہر کی ہے کہ اس سے قطع نظر کہ وہ فلسفی اور شاعر ہے، بنیادی طور پر وہ ایک مردِ درویش یا مردِ روحانی ہے اور فلسفے کے لحاظ سے اس کی شاعری اور تیزیِ ذہن کے پہلو کی برتری اس کے عشق یا 'حقیقت' کی طرف سے الہام کے تابع ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے اس نکتے سے غفلت اختیار کر رکھی ہے۔

بہر حال، اس کی تمام ذہنی و فکری مساعی کا حاصل یہ ہے کہ بقول اس کے "اس نے اپنی روحانی بصیرت یا عشق کو ایک ایسے فلسفے کی زبان میں بیان و واضح کیا ہے جو ماڈرن افراد کے لیے قابلِ فہم و ادراک ہے، اور اس راہ میں فلسفیانہ اور حامل فکر نظریات کا جو لباس اسے ہاتھ لگا، وہ اس نے بڑے ہی زبردست شاعرانہ اظہار کے ساتھ اس (روحانی بصیرت یا عشق) کو پہنا دیا ہے"۔

اقبال کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ لوگوں کو جنسی معاشقوں کے مضامین یا شاعرانہ نغموں سے جوش دلائے، اور نہ وہ اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ بطور ایک شاعر کے جانا جائے، چنانچہ کہتا ہے ؎

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم

(یہ خیال مت کرنا کہ میں شراب کے بغیر مست ہوں اور شاعروں کی طرح میں نے افسانے گھڑے ہیں)

ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

او حدیثِ دلبری خواہد زمن
رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیِ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

(وہ مجھ سے عاشقانہ باتوں کا طالب ہے، مجھ سے شاعری کی چمک دمک کا تقاضا کرتا ہے۔ = اُس کم نظری نے میری روح کی بے قراری نہ دیکھی۔ اُس نے صرف میرے ظاہر کو دیکھا میرے

باطن میں نہ جھانکا)

اسی طرح ایک دوسری جگہ یوں اظہارِ خیال کرتا ہے ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را[۹]

اِس سے پیشتر اِس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اقبال کیونکر اِس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تمام فلسفے جو خدا کے ساتھ عشق سے یا حقیقت کے صحیح مفہوم سے بے بہرہ رہے ہیں، غلط اور ناقص اور نتیجۃً بے معنی و بیہودہ ہیں؛ اور اگر اقبال عشقِ خداوندی کے عطیے سے نہ نوازا گیا ہوتا تو اِس بات کا امکان نہ تھا کہ اسے حکمت کے اس گراں بہا حصے تک رسائی میسّر آتی۔ نیز یہ بات تکلّف کے طور پر نہیں کہی گئی بلکہ اقبال ذاتی طور پر گواہی کرتا ہے کہ وہ عرفان اور بصیرتِ روحانی کی بلند سطح پر جا گزیں ہے اور معرفتِ خدا میں اُسے ایک مقامِ رفیع حاصل ہوا ہے۔ حکمت یا معرفت کی اِس سطح کو اور عشق کے اس مرحلے کو اقبال 'سوزِ دروں' سے تعبیر کرتا ہے، اور اسی طرح اِس قسم کی ترکیبات سے 'جانِ بے تاب'، 'خدا مستی' اور 'بادۂ ناب' وغیرہ؛ جبکہ خود کو وہ 'درویش' 'قلندر' اور 'فقیر' ایسے ناموں سے پکارتا ہے اور یہ سب عرفانی اصطلاحات ہیں۔ اِسی مناسبت سے وہ کہتا ہے ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دِلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

..... اور زندگی کے آخری دنوں میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے ؎

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اسی مناسبت سے ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے[۱۰]

(خرد، عصرِ حاضر کے پاؤں میں زنجیر کی صورت ہے۔ جو بے قرار جان میرے پاس ہے، وہ اور کہاں ہے!)

نیز ؎

اعجمی مردے چہ خوش شعرے سرود
سوز و داز تاثیرِ او جاں در وجود

عجمی اور غیر عرب مرد سے مراد خود اقبالؔ ہے جس نے ایسے اشعار کہے ہیں جن کی تاثیرِ سوز اور جوشِ درونی سے روح بدن میں شعلہ ساماں ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ جو بھی ادیب فکرِ اقبال کی توضیح و نشان دہی کی ذمہ داری لینا چاہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا عمل منظّم فلسفے کی تنظیم کی صورت میں مسلط ہو تاکہ اُسے پتہ چلے کہ یہ ظواہر اور افکار کس حد تک فکرِ اقبالؔ کے ساتھ موافق اور کس حد تک اور کہاں کہاں ناموزوں اور ناموافق ہیں۔

اقبال کے فکر و فلسفہ کا جو شارح یہ دو فرائض انجام دے سکتا ہے (اقبالؔ کے منتشر و پراگندہ افکار کے عقلی ربط و تعلق کے فہم کی وساطت سے) وہ نہ صرف اس بات پر قادر ہوگا کہ فکرِ اقبالؔ کو ایک منظّم اور مستقل فلسفیانہ شکل دے بلکہ وہ اُن جدید علمی ظواہر اور تازہ فلسفیانہ افکار کو بھی ایک منظّم سسٹم میں لا سکے گا جو اقبالؔ کے فکری رجحانات کے مطابق ہوں گے، اور یوں وہ اقبالؔ کے فلسفے کی تقویت و تائید کے اسباب فراہم کرے گا۔

اور یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ جو فلسفہ بھی حقیقت کے صحیح مفہوم پر مبنی ہوگا، اُس کی ہر جنبش زنت بلاشبہ بیشتر پیش رفتوں کے لیے راہ ہموار کرے گی۔ اس بنا پر جب اقبالؔ کا فلسفۂ خودی ایک منظّم صورت اختیار کر کے کامل تر انداز میں ظہور پذیر ہوگا تو آخر کار وہ کہیں زیادہ کمال و ترقّی سے بہرہ ور ہوگا جس کی کوئی انتہا نہ ہوگی کیونکہ علم کے عمارہ سرِ رشتے سے وابستہ تمام روز افزوں ظواہر اس کے اٹوٹ اجزا بن جائیں گے۔ اس طرح تمام مفکّرین اور فلاسفہ اختتامِ عالم تک، کسی وقفے کے بغیر، فلسفۂ اقبالؔ کی توسیع، تشریح اور تحکیم (محکمی) میں حصّہ لیتے رہیں گے اور اس بات کا کوئی خوف نہ ہوگا کہ ان کی یہ شرکت (یعنی حصّہ لینا) کسی بھی صورت میں، اقبالؔ کے فلسفے کے سبب، بے جان، بے رونق یا بے کار ہوگی۔

.... غرض فکرِ اقبالؔ کی توضیح و تشریح ہمیں بالآخر ایک ایسے دَور اور عصر میں پہنچا دے گی جہاں صرف ایک فلسفہ باقی رہ جائے گا اور بس، اور وہ ہوگا اقبالؔ کا فلسفۂ خودی اور اس موقع پر باقی تمام فلسفے یا تو مٹ جائیں گے یا پھر انسان کے دورِ جاہلیت کی داستانوں کی صورت رہ جائیں گے جن پر زندگی کے اثر کا بوجھ نہ ہوگا۔ یہی وہ امر ہے جس کی بنا پر اقبالؔ نے اپنی چشمِ اُمید مستقبل پر لگا رکھی ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس کے فلسفیانہ مقام کی پہچان اور اس کے نظریات کی پذیرائی، آج کے لوگوں کی نسبت، آنے والے لوگوں کے ذمّے زیادہ ہوگی۔ اسی خیال کے پیشِ نظر وہ کہتا ہے ؎

انتظارِ صبحِ خیزاں می کشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

نغمہ ام از زخمہ بی پروا ستم
من نوائے شاعر فردا ستم
عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسف من بہر این بازار نیست
نغمۂ من از جہان دیگر است
این جرس را کاروان دیگر است[۱]

کمال کی تلاش میں

واضح ہو کہ جن دو نکتوں یا دو ضرورتوں کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے، وہ ایک ایسی خاصیت کی حامل ہیں جس سے ایک عام آدمی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، اور عام لوگ پہلی ضرورت یا دوسری ضرورت کو مکمل میں نہیں لا سکتے کہ یہ تو اُن بہت ہی نادر اور گنے چُنے افراد کا فرضِ خاص ہے جو شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں اور وہ بھی عصرِ حاضر میں کہ متدین لوگ اور روحانیت سے تعلق رکھنے والے یا ایسے افراد جو مذہبی رجحانات کے حامل اور افکارِ دینی کے مالک ہیں، جدید معلومات اور علومِ عصری سے بے خبر ہیں۔ پھر وہ لوگ جنہیں جدید علوم اور فلسفے میں دسترس ہے، وہ مذہبی میلانات اور صحیح دینی پہلو سے عاری ہیں یا یہ کہ وہ روحانی رجحانات نہیں رکھتے۔ اس صورت میں ہم بہت ہی کم ایسے افراد آگے لائیں گے جو مذہبی فکر کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ قدائی عشق سے بھی متہم ہوں گے اور انہیں عصری علوم پر بھی پوری پوری دسترس ہوگی۔ فلسفۂ اقبال میں 'خودی' کی اصطلاح 'آگاہی' یا ایسے شعور کے معنی لیے ہوئے ہے جو وجدان کے ساتھ خود آگاہ ہے۔ (یہاں جناب سعیدی نے وجدان اور شعور کی تفصیل سے وضاحت کی ہے)..... اس بنا پر انسان نہ صرف حاملِ وجدان ہے بلکہ وہ ایک ایسے وجدان کا مالک ہے کہ خود آگاہی اور خود شناسی بھی اس کے امتیازات میں سے ہے، اور یہی وہ خود شناسی و خود آگاہی ہے جسے اقبال 'خودی' سے تعبیر کرتا ہے....

اقبال نے کائنات اور انسان کی حقیقت کے ہر پہلو کو موردِ بحث قرار دیا اور زندگی کے ہر ایک عملی رکن سے متعلق اصول کے بارے میں اپنے نظریات کی تشریح کی ہے۔ پھر اُس نے فی المثل یہ کوشش کی ہے کہ وہ اِس قسم کے سوالات کا جواب دے:- کائنات کی حقیقت کیا ہے، خلقت کیا ہے، کمال کیا ہے، مادّہ کیا ہے، حیوان کیا ہے، انسان کیا ہے، غریزہ (سرشت) کیا ہے اور کس طرح وجود میں آئی ہے، تصور کیا ہے، حافظہ کیا ہے، کوشش کیا ہے، شوق و آرزو کیا ہے، علم کیا ہے، عقل کیا ہے، ہوش (فہم و شعور)

کیا ہے، الہام کیا ہے، عشق کیا ہے، فقر کیا ہے، سیاست کیا ہے، تاریخ کیا ہے، جنگ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔
اقبال کوشش کرتا ہے کہ وہ ان تمام سوالوں کا جواب دے، اس لیے کہ اس کا یہ خیال ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب صرف ماہیتِ خودی میں پوشیدہ ہے؛ اور چونکہ وجدان یا شعور، حیات کے بغیر اور حیات وجدان یا آگاہی کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتی، اسی لیے وہ اکثر خودی کو حیات سے بھی تعبیر کرتا ہے۔ خودی کا مرکزی اور بنیادی امتیاز عشق ہے، اور محض عشق ہی کی وساطت سے خودی اپنے تمام ممکنات سامنے لاتی اور خود کو کمال تک پہنچاتی ہے؛ چنانچہ اسی مناسبت سے وہ کہتا ہے ؎

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت شود پاینده تر
زنده تر، سوزنده تر، پاینده تر
از محبت می اشتعالِ جوہرش
ارتقائے ممکناتِ مُضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق

..... خودی اس محرک کی تسکین کے لیے کسی اعلیٰ مقصد یا ہدف کی تلاش میں کامل ہے، اور جب بھی کوئی ایسا مقصد یا ہدف اس کے سامنے آتا ہے جو اس کی نظروں میں زیبا ہو تو وہ تہِ دل سے اس کے ساتھ وابستگی پیدا کر لیتی اور اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ تلاش و جستجو کرتی ہے اور نتائج سے بے پروا ہو جاتی ہے۔

اس طریقے سے خودی تمام پوشیدہ قوتوں اور توانائیوں کو کام میں لاتی ہے تاکہ اس کے راستے میں جو بھی رکاوٹیں آئیں انہیں عبور کر سکے اور تمام مشکلات پر قابو پا کر اپنے مقصد و ہدف تک پہنچ سکے۔

مقصد تک رسائی یعنی خودی کی حکومت اور غلبہ، اور اسی طرح اس کا جلوہ اور ظہور ـــــ یہی وجہ ہے کہ تسلط یا ذاتی جلووں کے محرک سے رغبت ایک دوسری صفت ہے جو تقاضائے عشق سے وجود میں آتی ہے

چنانچہ اقبال کہتا ہے ؎

زندگانی را بقا از مدّعا ست
کاروانش را درا از مدّعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است

(زندگی کی بقا مقصد سے ہے۔ اس کے قافلے کا جرس مقصد سے ہے۔
زندگی تلاش و جستجو میں پوشیدہ ہے اس کی جڑ آرزو میں پنہاں ہے)

...... ایک اور جگہ کہتا ہے

آرزو ہنگامہ آرائے خودی
موجِ بے تابے ز دریائے خودی

(آرزو، خودی کی ہنگامہ آرا ہے۔ وہ یعنی آرزو، خودی کے سمندر کی ایک بے قرار موج ہے)

.........(جناب سعیدی خودی کی تشریح اور اس کے غلط مطالب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہتے ہیں)
مومن کا ہدف و مقصد صبحِ صادق کی مانند روشن ہے، اور یہ ہدف جمال کا بلند ترین نقطہ اور اوجِ کمال ہے، اور چونکہ مومن کا مدّعا خدائے بزرگ و برتر ہے، لہٰذا مدّعا و ہدف آسمانوں سے بلند تر اور عظیم تر ہے۔ اقبال کہتا ہے

اے ز رازِ زندگی بیگانہ، خیز
از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ
ماسوٰی را آتشے سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالا ترے
دل ربائے، دلستانے، دلبرے

(اے زندگی کے راز سے بے خبر انسان اُٹھ۔ کسی مقصد کی شراب پی کر مستی کے عالم میں اٹھ۔
وہ مقصد و مدّعا ایسا ہو کہ صبح کی مانند درخشاں ہو، جو غیر اللہ کو جلانے والی آگ ہو۔
ایسا مقصد جو رفعت میں آسمان سے بلند تر ہو، جو دل ربا ہو، دلستاں اور دلبر ہو۔)

اِس سے قبل یہ کہا گیا ہے کہ اقبال کے نظریے کے مطابق 'خودی' یعنی خود شناسی و خود آگاہی انسان کی خاص خود شناسی ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خودی آئی کہاں سے ہے۔ آیا خودی مادّے کی صفات

اور عوارض میں سے ہے جو مادّے کے ارتقاء کے دوران اس صورت میں ظاہر ہوئی اور بالآخر موجودات بشری کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے؟ اگر یہ بات صحیح ہو تو پھر خودی مادّے ہی کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے، لیکن اگر وہ مادّے سے کٹ جائے تو باقی نہیں رہ سکی۔

مادّے کے فلسفی (مادّیت پرست) اس خیال کی طرف مائل اور اس عقیدے کے حامل ہیں کہ مادّہ اپنے ارتقاء کے دوران ایک ایسے مرحلے پر پہنچا ہے جہاں اس کے طبیعی اور کیمیائی خواص اس انداز سے عمل پیرا ہوتے ہیں کہ گویا اُس (مادّے) نے وجدان (یا شعور و آگاہی) حاصل کرلیا ہے یا ہم کہیں کہ زندہ ہے اور زندہ مواد Organism کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وجدان و شعور، (یا آگاہی)، آرگنزم (نامیاتی جسم) کے مغز یا سلسلۂ اعصاب میں متمرکز ہو جاتا ہے اور جب زندہ مادّہ حرکت میں آتا ہے اور آرگنزم کا مغز ارتقاء کی طرف بڑھتا اور دوسری شکلیں اختیار کرتا ہے تو وہ خود آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ انسانی مغز کی ساخت ہر حیوان کے مغز سے زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہے۔

غرض اگر اس قسم کے نقطۂ نظر کو درست اور صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس کے بعد کوئی اور زندگی نہ ہوگی! لیکن اقبال اس نقطۂ نظر کا سخت مخالف ہے۔ وہ ایک مادّی فلسفی کے پیرو مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

تری نجات غم مرگ سے نہیں ممکن
کہ تُو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

..... اقبال کے مطابق خودی، مادّے کی ترقی یافتہ صورت نہیں ہے بلکہ کائنات کی آخری حقیقت ہے، اور وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنی صفات کے اظہار کے لیے مادّے کی تخلیق کرتی اور اسے اپنی جلوہ گری اور اظہار کا وسیلہ بناتی ہے۔ اس طرح خودی، مادّے کی تکمیل کے سلسلے میں، تدریجی گردش کے ذریعے، حیاتیاتی کمال کے مخصوص ہدف کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اقبال اس موضوع کو یوں پیش کرتا ہے ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

(ہستی کا وجود خودی کی نشانیوں میں سے ہے۔ جو کچھ تُو دیکھ رہا ہے، وہ خودی کے بھیدوں میں سے ہے۔)

اقبال اور مادّیت پسندوں کے اِس ٹکراؤ یا مقابلے میں آخری علمی نظریات اقبالؔ کے نظریے کے موافق اور مادّیت پرستوں کے عقیدے کے مخالف دکھائی دیتے ہیں۔

آخر میں جناب سعیدی نے یہ توضیح کی ہے: پہلے اس امر کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ فزکس اور سائیکولوجی کے علماء (ماہرینِ طبیعیات، حیاتیات، نفسیات) کی تحقیقات اقبالؔ کے علمی نظریات کی تائید کرتی ہیں، اور عصرِ حاضر میں ان تین علوم کے محققین اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ مادّہ نہ صرف اصالت سے عاری ہے بلکہ وہ دیگر قوتوں کے تابع اور توانائی کے فعل اور انفعالات (عمل اور ردِّ عمل) کی پیداوار ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ مادّیت پرستوں کی منطق آج شکست کھا چکی ہے، اور یہ شکست اقبالؔ کے نقطۂ نظر اور تمام خدا پرستوں کے مفاد میں ہے۔ اُس (اقبال) کی روح شاد ہے اور روزِ قیامت وہ اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اٹھایا جائے!

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حواشی

۱۔ یہ مصرع کتاب میں اس طرح ہے کہ گذر با عقل سمجھی آگی کہ یہ نور۔ مرتب کتاب نے اُردو سے ناواقفیت کی بنا پر اسے بے وزن و بے معنی بنا دیا ہے۔

۲۔ کتاب میں 'عشق' چھپا ہے جو غلط ہے۔ اسی طرح اُردو کے بھی بعض اشعار غلط چھپے ہیں۔ پروف ریڈنگ میں کوتاہی اس کا باعث ہو سکتی ہے۔ یزدانی

۳۔ جناب سعیدی کا اشارہ اس شعر کی طرف ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (یزدانی)

۴۔ بالِ جبریل 'کلیاتِ اقبال اردو'۔ شیخ غلام علی، لاہور صفحہ ۳۹۲/۱۰۔

جناب سعیدی نے جتنے بھی اردو شعر نقل کیے ہیں ان میں سے بیشتر کی شکل پریس والوں نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں بدل دی ہے۔ صرف یہی شعر ملاحظہ ہو ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُن کا میری آئینۂ ادراک میں ہے

۵۔ اشارہ ہے 'مسجدِ قرطبہ' کے اس شعر کی طرف

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب (یزدانی)

۶۔ پوری رباعی اِس طرح ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد..... الخ۔

ارمغانِ حجاز 'کلیاتِ اقبال فارسی'، شیخ غلام علی لاہور، صفحہ ۱۲/۸۹۴

۷۔ جناب سعیدی کا نوٹ: اتفاق سے اس پیغام میں شاعر کا روئے سخن زیادہ تر ایرانی نوجوانوں کی طرف ہے۔ راقم نے اپنے حصّے کے مطابق، فکری بحران کے زمانے میں، اس سے حیات افروز

بہرہ حاصل کیا ہے (رحمۃ اللہ علیہ)

۸۔ صحیح 'بینی' ہے۔ غالباً جناب سعیدی نے حافظے سے کام لیا ہے (ملاحظہ ہو پیامِ مشرق ص ۱۹،
کلیاتِ اقبال فارسی ص ۱۸۹۔ مطبوعہ شیخ غلام علی، لاہور۔ اس سے قبل بھی یہ شعر اسی طرح درج
ہوا ہے۔

۹۔ کتاب درشناختِ اقبال میں اس کے دو شعر بنائے گئے ہیں۔

۱۰۔ دلچسپی کے لیے مقالے میں درج اصل شعر ملاحظہ ہو

دسری کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے،

۱۱۔ ان اشعار کا ترجمہ کسی دوسرے مضمون میں دیا جا چکا ہے۔

۱۲۔ ان اشعار کا ترجمہ کسی دوسرے مضمون میں آچکا ہے۔

۱۳۔ مقالے میں درج شعر:

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

---

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

علامہ اقبال کے والد بزرگوار شیخ نور محمد مرحوم